ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July - September)

Animal is a Symbolic Character in Majeed Amjad's Poems
مجید امجد کی نظم میں جانور بطور علامتی کردار

Humaira[1]
Afshan Jabeen[2]
Safdar Ali Shah [3]

Abstract: As far as modern Urdu poetry is concerned, Majeed Amjad is widely regarded as a multi-faceted, universal, and leading poet. In this article, an attempt has been made to examine and x-ray the psychological and cultural dimensions of his characters inspired by and taken from nature. Majeed Amjad has created a magnificent pageant of characters using the phenomena of nature as his ultimate inspiration and muse. And thereby, he has interpreted the obvious and hidden aspects of life in such a manner that makes us realize that nature is an inexhaustible and incredible treasure trove of sympathy, love, freedom, struggle for survival, knowledge, and wisdom. Majeed Amjad, as if to very profound psychological evolution, is completely lost in his characters. His poetry affords us an everlasting and ever-relevant lesson: we can be eternally in touch with the higher reality only by living in the very heart of nature and by living in perfect harmony with nature.

مجید امجد کی نظم میں جانور بطور علامتی کردار

زندگی کے ظہور سے لے کر موجودہ دور تک زندگی کے فلسفیانہ اصول، قدرت کے قوانین کے تابع ہیں۔ زندگی آغاز سے انجام تک وقت، خوراک اور اپنی نسل کی افزائش کے اصول پر کارفرما ہے۔ موت کی ازلی و ابدی رکاوٹ اس کو پھلنے پھولنے سے نہیں روک سکتی۔ زندگی نے اپنی قوت، ایجاد، دفاع اور شکار کی صلاحیتوں کے بل بوتے پر علم و عمل کے تجربات کے ذریعے انسان کی بدولت ستاروں، سیاروں تک رسائی حاصل کی تو دوسری طرف اسی انسانی زندگی نے اپنے قدرتی اصولوں کے علاوہ سیاسی، سماجی اور معاشی جبریت کے اصول قائم کر لیے ہیں۔ جہاں ایک انسان جانور کے متعین مقام سے آگے ترقی نہیں کر سکتا۔ محنت برائے محنت کے بے سود دائرے میں گھومنے پر مجبور ہے۔ اسی فلسفیانہ حقیقت کا انکشاف مجید امجد کی نظم ''کنواں'' (۱۹۴۱-۱۲) میں بیلوں کی کرداری پیش کش میں کیا گیا ہے۔ جہاں پہ جدید تہذیب کے باطن میں وہی جبر کی تہذیب کارفرما ہے۔ جہاں بیلوں کے ساتھ کنواں،

[1] Assistant Professor Department of Urdu Islamia Collage Peshawar at-Zari39@yahoo.com
[2] Lecturer Department of Urdu Malakand University at-Afshanjabeen644@gmail.com
[3] Assistant Professor of Urdu Higher Education Department at-safdarashah7@gmail.com

گادھی والا کھیت اور کنویں سے نکلنے والا خون رگ پانی، کھیت، فصلیں سب ایسی زمینی علامتیں ہیں جس سے کائنات کے بے رحم نظام جبر کی گتھیاں بھی کھلتی ہیں۔ ایک نظر اس نظم کے اشعار پر ڈالیں۔ نظم کی خارجی سطح سے ہندوستان کا عوامی کلچر نظر آتاہے۔

" کنواں چل رہا ہے! مگرکھیت سوکھے پڑے ہیں نہ فصلیں' نہ خرمن' نہ دانہ'نہ شاخوں کی بانہیں' نہ پھولوں کے مکھڑے'نہ کلیوں کے ماتھے'نہ رت کی جوانی گزرتا ہے کیاروں کے پیاسے کناروں کو یوں چیرتاتیز' خوں رنگ'پانی کہ جس طرح زخموں کی دکھتی تپکتی تہوں میں کسی نیشتر کی روانی

ادھر دھیری دھیری

کنوئیں کی نفیری

ہے چھیڑے چلی جا رہی اک ترانہ

پر اسرار گانا (1)

پانی انسانی زندگی کی ابتدا، فروغ اور فطرت کے ارتقا کا سبب ہے۔ جہاں بھی دنیا کی قدیم تہذیبیں جیسے سبا، مصر (بابل و نینوا) مایا تہذیب، وادی سندھ کی تہذیب، اور چائنہ کی تہذیب ، یہ سب دریاؤں کے کنارے پھلتی پھولتی رہی ہیں۔ عبرانی پیغمبر ہو یا کہ یونانی شاعر، رومی انجینئر ہوں کہ ہندو مہاتما، جاپانی مصور ہو یا پھر فارسی فرمانروا ہو ان سب کی ترقی کا دارو مدار پانی کے وسیع وسائل پر قبضہ اور اس پانی کو زراعت کے لیے استعمال کرنا ہے۔ جہاں پانی حضرت نوح علیہ السلام کے لیے عذاب کا باعث بناتو وہاں پانی کی قلت نے خشک سالی پیدا کی ۔ پانی کی تلاش میں یہ انسانی تہذیبیں دنیا کے دوسرے علاقوں میں ہجرت کر گئیں۔ بقول ول ڈیورانٹ:

" وسطی ایشیا کے خشک علاقے کبھی نم اور معتدل تھے۔ یہاں بہت جھیلیں اور ندیاں تھیں۔ آخری، برف کی لہر کی مراجعت نے اسے خطے کو خشک کر دیا حتیٰ کہ شہروں اور ریاستوں کے لیے بارش ناکافی رہ گئی۔ لوگ شہروں کو خالی کر کے پانی کی تلاش میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب کی طرف بھاگ نکلے۔"(2)

انسان جب دھات کے دور میں پہنچا تو زمین کو کھود کر کنویں بنائے۔ مصر کی تہذیب میں کنوؤں اور بیلوں کی مدد سے رہٹ کا نظام وضع کیا گیا ہے۔ اس لیے بیل کی علامت دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں خوشحالی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ یوں مجید امجد کی اس نظم کے پس منظر میں اجتماعی لاشعور کی آبیاری نظر آتی ہے۔ نظم کے تخلیقی پس منظر میں ناصر شہزاد لکھتے ہیں:

" مجید امجد کی آؤ بھگت کے بعد تخت سنگھ انھیں اپنے گاؤں کے کھیت اور کھلیان دکھانے کے لیے اپنے گاؤں سے باہر لے گئے۔ جہاں ایک کنواں کھدا ہوا تھا۔ اور اپنے آس پاس کی فصلوں کو سراب کر رہا تھا۔ ٹیوب ویل کی ایجاد سے بیشتر پورے پنجاب بلکہ پورے برصغیر پاک و ہند میں زمین کھود کر کنویں تعمیر کیے جاتے تھے۔ جس کے اوپر ایک ''بیٹر'' ہوتا تھا۔ اور ''بیٹر'' پر لوہے کے لوٹے جو ایک چکر میں ہوتے تھے۔ ان کے ذریعے سے ''گادھی'' کے آگے بیل جوت کر پانی نکالا جاتا تھا۔ جس سے آس پاس کی فصلیں پروان چڑھتی تھیں۔"(3)

جدید دور میں رہٹ کے نظام کی جگہ ٹیوب ویل نے لے لی اور بیلوں کی جگہ ٹریکٹر نے لے لی۔ اس سائنسی انقلاب سے قطعہ نظر مجید امجد نے ازل سے لے کر ابد تک انسانی ارتقاء میں کنویں کو ایک علامتی کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس علامت کی داخلی اور خارجی دو سطحیں ہیں۔ خارج میں یہ زرخیزی اور دریافت کی علامت ہے۔

باطن میں یہ ایک ایسا معاشرتی نظام ہے جو حکمرانوں نے قائم کر رکھا ہے۔ بیلوں کے کردار سے مراد مجبور و بے بس انسان ہے جو اپنے وجود کی بقا کے لیے اس نظام کی گردش میں گرداں ہے۔ اس کی زندگی کی یہ دائروی حرکت اس نظام سے خون رنگ پانی باہر لا رہی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ تہذیب کے کھیت سوکھے پڑے ہیں۔ تخلیقِ فن کے پھول علم کے چمن میں کھلتے نہیں ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ جبکہ ہر انسان جوڑے کی صورت میں زندگی کا معیار سطح بلند کرنے کے لیے جبر و ا ستبداد کے بھاری سلاسل میں تازیانے کھا رہا ہے۔ کیا یہ انسان کی تقدیر کا لکھا ہوا ہے کہ وہ بے سود زندگی کی گردش میں رہے گا اور موت ایک ایک کر کے اس کو شکار کرتی رہے گی۔ کنوئیں کے مالک کی علامتی نوعیت کی خارجی سطح میں حکمران طبقہ ہے جو عوام کی ترقی و خوشحالی سے بے نیاز ہے۔ داخلی سطح میں خدا کی طرف اشارہ ہے جو اس کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے لیکن اس لمحہ اس سے بے نیاز ہو کر قدرت کے اصولوں پر چھوڑ دیتا ہے کہ جس طرف اس کی توجہ ہو گئی وہاں تہذیب کے کھیت سیراب ہو گئے۔

قوموں کو عروج مل گیا وہ تو اپنی ''بنسی'' یعنی نظام تعمیر و تخریب کے آہنگ میں گم ہے۔ زندگی فنا ہو کر ہوا میں خوشبو کی طرح بکھر گئی ہے۔ کنوئیں کی گردش یعنی کائنات کی گردش کائنات کی ہر شے میں دوجہانوں کو اپنے ہمراہ لیے چل رہی ہے۔ یوں کنوئیں کے اس کائناتی نظام میں انسان زندگی کی لایعنی دائروی حرکت نے اس کو بیل بنا دیا ہے۔ یوں انسانی زندگی وہیں کی وہیں ہے جہاں سے اس نے آغاز کیا تھا۔ نظام بدل گئے۔ مسائل بڑھ گئے ہیں اور جبری گردش میں لغویت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ زندگی فنا سے پہلے ہی فنا کی صورتحال میں گرفتہ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شاہین مفتی لکھتے ہیں:

"نظام کے تھکے ہارے، اپنی مرضی و منشاء سے ہاتھ کھینچتے ہوئے مجروح عوام لاغر بیلوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ بنتی اور بگڑتی تہذیبوں کا یہ بے ثمر کنواں فکری بانجھ پن کی علامت بھی ہے کہ اس کی گردش تلے نو آبادیاتی نظام" (4)

بیلوں کا یہ کردار دنیا کے عالمی سیاسی سماجی تناظر میں دائرے کو توڑ کر افقی سمت میں صرف ایک صورت میں نکل سکتا ہے کہ وہ آسمان کی طرف روحانی پرواز اختیار کرے۔ کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں زمین ہی وہ کنواں ہے کہ جس پر زندگی کے خوں رنگ پانی میں پہنچ کر فطرت کی کیاریوں کو توڑ پھوڑ کا شکار کر دیا۔ زندگی کا سفر اس زمین پر دائرے سے نکل کر بھی خطِ مستقیم میں چلنے لگتا ہے۔

پھر بھی انسان کی محدودیت، جبریت کے آگے اسے بیل بنائے رکھتی ہے نظم ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' (۱۲-۸-۱۹۵۹) میں قدرتی ماحول کے جبر میں آئے ہوئے ایک ہالی کے کردار کو بیلوں کے کردار میں تبدیل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جیٹھ، ہاڑ کے موسم میں بیلوں کے ذریعے زمین میں ہل چلانا اور اس کو کاشت کے لیے تیار کرنا ہندوستانی تہذیب کا عام سا مظہر ہے۔

مجید امجد بیلوں کی یہ تہذیب وادی سندھ کی تہذیب تک لے جاتے ہیں۔ تین ہزار قبل سے لے کر آج تک اس بیل نما انسان کے مقدر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جس کا اعتراف مجید امجد ان اشعار میں کرتے ہیں:

سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کے فرمان

مٹی کاٹے، مٹی چاٹے، ہل کی آنی کا مان

آگ میں جلتا پنجر ہالی کا ہے کہ انسان

کون مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں جیسے اس کے لیکھ
(5) تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں تین بیل ہیں، دیکھ

نظم ''کنواں'' اور ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' کا موازنہ کیا جائے تو آفاقیت مقامی رنگ میں ڈھلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ''ہڑپے کا ایک کتبہ'' میں آفاقی نظام کے جبر کے بجائے مقامی ماحول میں زندگی کی نچلی سطح دکھائی گئی ہے۔ بیل کے اوصاف پر غور کریں تو اس کی مضبوط اور موٹی جسامت، انسان کی مادیت پرستی کو ظاہر کرتی ہے۔ بیل ایک ایسا جانور ہے جو بے تحاشا محنت کی علامت ہے جس کا نفع دوسرے اٹھا لیتے ہیں اور اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی یہ بار برداری کے بھی کام آتا ہے۔ بیلوں کو آپس میں لڑانا بھی آسان ہے۔ اسی لیے حکمران طبقہ عوام کو ہمیشہ بیلوں کی سطح پر رکھنا چاہتا ہے تاکہ جب چاہا ان بیلوں سے محنت لی اور بوقت ضرورت ان کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ حکمران ہمیں بیلوں کی طرح ہانک کر جس طرف لے کر جا رہے ہیں اس کی ثقافت خود ان کی بھی تباہ و برباد کر دے گی۔ جو عام آدمی ہل جوتنے والے دو بیلوں کے ساتھ تیسرا بیل ہے جس کی روزمرہ زندگی کے حالات کو کوئی تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ بقول سید عامر سہیل:

صاف ظاہر ہے کہ ''کنواں'' میں مجید امجد نے یہ علامت عام انسانوں کے لیے برتی ہے جبکہ نظم ''ہڑپے کا ایک '' کتبہ'' ایک مکمل تہذیبی پس منظر کی حامل ہے۔ اگرچہ اس نظم میں بھی ایک پہلو جبریت ہی کا نکلتا ہے۔ کیونکہ مجید امجد دو بیلوں کی تہذیب (وادئ سندھ کی تہذیب) کی بجائے تین بیلوں (دو بیل اور ایک ہالی) کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ (6)''یعنی مجید امجد نے اس تہذیبی علامت کو سیاسی اور سماجی منظر نامے میں رکھ کر دیکھا ہے۔

اس بیل کے کردار کو نظم ''گوشت کی چادر'' (۱۷۔۹۔۱۹۶۸) میں بھی اسی طرح کے تہذیبی حوالے سے پیش کیا گیا ہے جو کم از کم اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا تو سکھ فراہم کرتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو محنت کش زمینداروں کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ جن کو اپنی مجبور سادہ زندگی کی بے معنویت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ فطرت کی گود میں پلنے والے یہ محنت کش لوگ زندگی کی بے معنویت اور با معنویت سے آگاہ بھی نہیں۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کون ان کا کیسے استحصال کر رہا ہے۔ نظم ''بارکش'' (۶۔۶۔۱۹۶۲) میں گھوڑے کے علامتی کردار کے ذریعے ایک مزدور کی زندگی کے دکھ درد کو پیش کیا گیا ہے کہ اس سے اتنا زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اور کام کے دوران اس مزدور کی بات تک نہیں سنی جاتی۔ اردگرد کے انسان اور کام لینے والا مالک جبر و استبداد کی بے رحم علامت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ جو اس کی آنکھوں سے درد و الم کے تاثر کو پڑھنے سے قاصر ہے۔ مجید امجد نے اس کردار کی پیش کش میں الم ناک مناظر سے کام لیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

چیختے، پہے، پتھ، پتھریلا، چلتے بجتے سم
تپتے لہو کی رو سے بندھی ہوئی اک لوہے کی چٹان
بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے جنور! ترا یہ جتن
(7) کالی کھال کے نیچے گرم گھٹیلے ماس کا مان

برطانوی سامراج کے نیچے محکوم قوموں کے مزدور غلاموں کی حالت بوجھ کھنچنے والے جانور کی سی ہو گئی تھی۔ جس کو قانون نے اپنے آہنی پنجے میں جکڑ کر دن، رات اس سے مشقت لی اور اس کی آنکھوں میں آنسو

کے سوا اس کو کوئی مزدوری نہ ملی، سرمایہ دارانہ نظام کے علمبر داران محنت کشوں کے گھروں میں ان کے ذاتی حالات کی دنیا کو اگر دیکھیں تو ان کے اندر ترقی پسندانہ سوچ بیدار ہو۔ بقول مظہر علی سید:

یہاں فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کا مضمون نہیں، سرمائے کے ہاتھوں، نمو کی قوتوں کی قتل عام کا المیہ درپیش ہے۔ "

اسی طرح جیسے "بارکش" میں محنت کش کی تصویر:

شعرا کے انداز میں فطرت کی (Natural) یہاں مجید امجد پہلی جنگ عظیم سے قبل نمودار ہونے والے انگریزی کے خوشگوار منظر نگاری نہیں کر رہا۔

بلکہ بے انصافی سے مسخ شدہ مجبور انسان کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ جدید شاعر کی زبان میں بھگتوں کی بانی بول رہا ہے۔"(8)

مجید امجد کی نظم میں حشرات الارض اور دیگر ضمنی کردار کی علامتی جہت

مجید امجد اپنی ذاتی زندگی میں بہت عاجز انسان تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی حالات میں جن کرب و آلام کو اپنے دل میں ضبط کیا اس کی بدولت ان کے مشاہدے میں فلسفیانہ نقطۂ نظر اور دکھ کے جذبات میں ہمدردی کا رنگ آ گیا۔ وہ زندگی کے سفر میں انسانی وجود کی لغویت میں اثباتِ زندگی میں کوشاں رہے۔ اس لیے ان کی زندگی میں عام آدمی، پسے ہوئے مجبور افراد کے کردار اکثر ملتے ہیں۔ حشرات الارض کو علامتی طور پر ضمناً اپنی ذات کے کردار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً نظم "طلوع فرض" (۱۹۴۳۔۸۔۱۶) میں نالی کے کیڑے کا کردار محض زندہ رہنے والے غریب ترین لوگوں کے لیے ہے۔ اس کے مدمقابل بھنورے کا کردار اورعیاش پسند امیروں کے لیے۔ نظم "رودادِ زمانہ" (۱۹۵۰۔۷) دو متضاد کردار ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے ہیں۔

اژدہے یا سانپ کا کردار انسانی تاریخ کے تسلسل پر پھیلا ہوا ہے جو ہر عہد ہر زمانے میں عوام کو سرمائے کی بدولت ڈستے آئے ہیں۔

ایسے لوگ وقت کے آگے وقت کی دیوار ثابت ہوئے ہیں۔ وقت کی تیز رفتاری کے آگے ان کے گرانڈیل جسم نابود ہو گئے، جب کہ تخلیق کار اور صداقت کے علمبردار جیسے مجید امجد خود ہیں۔ ایک تتلی کی طرح ابھرے ہیں۔ یہ لوگ احساس جمال اورروحانی قدروں کے امین ہیں۔ اس لیے زندگی کے تخلیقی مقاصد یعنی صداقتِ عظمی کا حسن پھول کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ یہ لوگ جو تتلی کی طرح ہیں اس کے ساتھ چمٹے رہے ہیں تو وقت کی آندھیاں ان کے وجود کو فنا نہ کر سکی۔ انھوں نے زندگی کے حسن کا اثبات کیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نور کو فنا نہیں۔ ان لوگوں کو جو تتلی کی علامتی جہت میں ابھرے ہیں ان کو بھی فنا نہیں ہے۔

چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے نور کے ساتھ منسلک ہے اس لئے وہ تخریب کے نہیں، تعمیر کے نمائندہ ہیں۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اللہ نور السموات والارض

ترجمہ: اللہ زمینوں و آسمانوں میں نور ہے۔ (9)

چونکہ مجید امجد خود عمل خیر کے تسلسل کے مبلغ ہیں۔ وہ سورج کی طرح بے لوث اپنی ذات میں جلتے رہے اور اپنے ماحول اور فطرت کے اپنے احساسِ جمال سے منور کیا۔ انھوں نے قوم کے ہر درد کو اپنے دل کا درد بنایا ہے۔ (۱۹۶۵ء) کی جنگ ہو یا پھر (۱۹۷۱ء) کا سقوط ڈھاکہ کا واقعہ ہو، مجید امجد قوم کے اندر ایک ایسے مناد

کے کردار میں ابھرے ہیں جو افرادِ قوم کو آنے والی آندھیوں سے آگاہ کرتے رہے ہیں۔ نظم ''چیونٹیوں کے ان قافلوں'' (۱۹۷۲۔۱۔۳) میں وہ افراد کو چیونٹیوں کی مانند ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی دکھ بھری نظم ہے جس میں (۱۹۷۱) کا سقوط ڈھاکہ کا سانحہ ایک ایسی طوفانی بارش تھا جس کا کیچڑ مدتوں پاکستان کے آنگن میں رہے گا۔ جو لوگ اس سانحے میں شہید ہو گئے یا مارے گئے ان کی زندگی کے قدموں کے نشان ثابت رہیں گے۔ مجید امجد بنگال میں شہید ہونے والے لوگوں سے کوسوں دور اپنے کمرے میں ٹھنڈی سانسیں بھر کے ان کے بارے میں جب سوچتا ہے تو وہ لوگ اسے چیونٹیوں کی طرح لگتے ہیں۔ جن کو حکمران طبقے نے اپنے پاؤں تلے کچل دیا۔ یہ نارسا چیونٹیاں کہ جن کی زندگیوں میں جو اندیشے تھے وہی ان کا امن تھے۔ جن خوشیوں کی ہزیمت کی خاطر ہماری قوم نے ان کا گلہ گھونٹ ڈالا۔ یہ خوشیاں اب خود زندہ بچ جانے والے لوگوں کے لیے بدامنی کا باعث ثابت ہو رہی ہیں۔

ملک کے بگڑے ہوئے سیاسی سماجی حالات نے ملک کو مقتل گاہ بنا دیا ہے۔ بقول کوثر نیازی:

"جولائی اتوار کو کراچی میں ہولناک بارشوں سے ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد ساڑھے تین سو تک پہنچ چکی ۳ تھی۔ کاروبار زندگی معطل تھا۔ چند روز پہلے تک جو فوجی جوان اپنے جرنیلوں کے حکم پر عوام پر گولیاں برسا رہے تھے، وہی کشتیوں اور دوسرے ساز سامان کے ذریعے عوام کو محفوظ مقامات تک پہنچانے اور ان کی بھرپور مدد کرنے میں مصروف تھے۔"(10)

یوں مجید امجد خارجی بظاہر فطرت کی مدد سے انسانی زندگی کی ہی تفہیم کرتے ہیں۔ نظم ''بارش کے بعد'' (۱۹۴۴۔۸۔۱۶) میں بارش کے بعد بازار کے مختلف مناظر پیش کر کے زندگی کی کم مائیگی کو ظاہر کیا ہے۔ اس نظم میں پروانوں کا تذکرہ جونان بائی کی دکان پر روشن چراغوں پر اپنے نفس کی بھوک مٹانے کے لیے اپنی جان سے بھی گزر گئے ہیں۔ زندگی اور موت کا یہ کھیل عام انسان کی زندگی میں رواں ہے۔ مجید امجد فطرت کے ان مظاہر جیسے شجر، پھول، پرندے، جانور، حشرات الارض کی علامتی پیش کش میں زیادہ تر بیانیہ یا ڈرامائی خود کلامی سے کام لیا ہے۔ ان کا مقصد مجبور و محکوم پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی اور انسانی ذات میں کائناتی تجلیوں کا پر تو دیکھنا ہے۔ وہ انسان کو فطرت کے قریب لا کر انسان بنانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف زندگی کے کل میں فطرت کا تحفظ انسان ہی کے تحفظ و بقا کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مندرجہ بالا کرداروں کی پیش کش میں انھوں نے انسان کے فطرتی رویوں اور سماجی رویوں کے مابین ٹکراؤ ایک ایسے انسانی المیے کو پیش کیا ہے جو ہزارہا صدیوں میں تہذیبی نشیب و فراز کے باوجود بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ اسی عالمی انسانی المیے میں نہ صرف دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بلکہ انسانی احساسات و جذبات پر مشینوں کی حکومت قائم ہوچکی ہے۔ مجید امجد کا مشاہدہ اتنا باریک ہے کہ انھوں نے خوردبین سے دکھائی دینے والے جراثیموں کو بھی علامتی خود کلامی کے ذریعے پیش کیا ہے۔ نظم ''خوردبینوں پہ جھکی'' (۱۹۷۲۔۱۲۔۹) کے اشعار ملاحظہ ہوں:

لیکن آج تمہارے جڑے جڑے جسموں کی لپیٹوں اور تمہاری گتھم گتھا روحوں کے گچھوں کے
اندر جب میرے دبلے سے دل نے اچانک
اپنے اکیلے پن میں اپنا رخ اپنی جانب دیکھا ہے تو تم میں ہوتے ہوئے بھی میرے دل کو تم پہ
ترس آیا ہے
..... آگے تو جو کچھ ہو

دنیا کے کے دھبے میں بھری ہوئی ہم سب بے چہرہ بے کل روحیں، ہم سب کلبلاتے جرثومے،
آگے جو کچھ ہو ..... اک بار تو خود پہ ترس کھا کر دیکھیں .....
شاید ہم کو دیکھنے کے لیے تقدیروں کو اپنی خوردبینوں کے زاویے بدلنے پڑیں.....(11)

مجید امجد نے یہاں اکیسویں صدی میں انسانوں کی حالت زار دکھائی ہے۔ ان کا شخصی وقار انسانیت کی سطح سے نیچے گر کراتنا کم ترین ہو گیا ہے کہ وہ جراثیم جتنے ہو گئے ہیں۔ ان پر حکمرانوں کی حیثیت ایسی ہے کہ وہ ان طاقتیں انسانوں کو کچھ اسی زاویے سے دیکھ (Super power) کی تقدیروں کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ عالمی سماج میں رہی ہیں۔ مجید امجد کو انسانوں کی عدم شناخت بے چہرگی اور بے مائیگی پر ترس آ گیا۔ لہجے میں طنز کی کاٹ پیدا ہو گئی ہے۔ یہاں وہ خود بھی ان جراثیموں میں شامل ہیں۔ لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی اپنے باطن کی طرف دیکھ سکتے ہیں۔ کہ ان کا تعلق روحانی سطح پر کائنات کی خالق ذات سے ہے۔ وہ تمام انسانوں کو اپنی شناخت کے لیے اپنے اندر جھانکنے کی دعوت دیتے ہیں۔ تاکہ اس خود آگہی سے کم از کم دنیا کے ظالم آنکھوں والے خداؤں کو ان کی تقدیروں کے فیصلے کرتے وقت اپنی سوچ کے آئینوں کے زاویے بدلنے پڑیں۔

مجید امجد ایک ایسی پراسرار شخصیت میں ڈھل جانے میں کامیاب ہوا کہ وہ زندگی کے باریک سے باریک مظہر کو ہم احساسی سطح پر ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔ پھر اس سے الگ ہو کر اس کا تجزیہ الگ شخصیت کی صورت میں کرتے ہیں۔ فطرت کے مظاہر کی کردار نگاری کرتے وقت مجید امجد نے اپنے احساس و جذبات کو اس فنی منیچر آرٹ میں ڈھال دیا ہے۔ جس میں انسانی زندگی اور فطری زندگی کے الم ناک حقائق جدید تہذیب کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور خدا ترسی وہ اوصاف ہیں جو انسانیت کی شناخت معدوم ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ اور انسانوں کا کھویا ہوا وقار بحال کر کے ان کو متعدد کر سکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

" اس نظم میں مجید امجد نے حقیقت کو دور بین سے دیکھنے کے بجائے (جو کائناتِ اکبر کو دیکھنے کا ایک زاویہ ہے) اسے خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھا ہے۔ (جو کائنات اصغر کو دیکھنے کی ایک جہت ہے) اور اچانک اسے حقیقت کے مظاہر ..... بے چہرہ، بے کل روحیں اور کلبلاتے ہوئے جرثومے نظر آئے ہیں، اور اس نے ایک ٹھنڈی میٹھی، ترس سے لبریز نظر ان پر ڈالی ہے۔ یہ ایک انوکھا تجربہ ہے جس سے مجید امجد گزرا ہے ..... ایک ایسا تجربہ ہے جس میں دردمندی کا احساس، ترس یعنی (Compassion) میں تبدیل ہو گیا۔"(12)

حوالہ جات

1 کلیات مجید امجد، کنواں، ص:۵۹

2 ول ڈیورانٹ، انسانی تہذیب کا ارتقاء، ص:۱۶۹

3 ناصر شہزاد، کون دیس گیؤ، ص:۳۱

4 شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، ص:۲۷۵

5 کلیات مجید امجد، ہڑپے کا ایک کتبہ، ص:۳۳۶

6 سید عامر سہیل، ڈاکٹر، نقش گرنا تمام، ص:۳۳۹

7 کلیات مجید امجد، بارکش، ص:۳۸۸

8 مظہر علی سید، مجید امجد بے نشانی کی نشانی، ص:۲۶۷

9 القرآن، آیت نمبر ۳۵، سورۃ النور

10 کوثر نیازی، اور لائن کٹ گئی، ص:۲۰۰

11 کلیات مجید امجد، خورد بینوں پہ جھکی.....، ص:۶۸۱

12 وزیر آغا، ڈاکٹر، مجید امجد کی داستانِ محبت، ص:۵۵